Date of Publication: 23-11-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 Nov. 2013 | POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
R.N.I No. 2186/57 | Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 December 2013 — یکم تا ۷ دسمبر ۲۰۱۳ء

Issue: 45, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۴۵، جلد نمبر: ۷۲

پہلی قسط

دارا شکوہ اور سلطنتِ عثمانیہ

دارا شکوہ کی زندگی کا ایک اَنجانا پہلو

پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی (پرو وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد-211002)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سترہویں صدی کے سارے شہزادوں میں دارا شکوہ سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور صداقت کا متلاشی تھا۔ وہ ۱۶۱۵ء میں پیدا ہوا اور صرف چوالیس سال زندہ رہا۔[1] اس مختصر زندگی میں اس نے پانچ کتابیں لکھیں اور دو کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ایسا کارنامہ تھا جو کم از کم جدید دور سے پہلے تو دنیا میں شاہی خاندان کے کسی بھی فرد نے نہیں کیا تھا۔[2] دارا کو ہندومت، اس کے مذہبی لٹریچر اور اس کے فلسفے سے دل چسپی تھی، یہ بات اس کی تصانیف سے ظاہر ہے لیکن اتنی ہی دل چسپی دارا کو تصوف سے بھی تھی۔ وہ ہر مسلک کے صوفیوں کی تعریف کرتا تھا اور احترام بھی، لیکن قادری سلسلے کو سب سے زیادہ مانتا تھا۔ ہندستان میں قادری سلسلے کے صوفیوں بالخصوص میاں میر (وفات ۱۶۳۵ء) اور ان کے مرید ملا شاہ بدخشی (وفات ۱۶۶۱ء) سے اسے جو عقیدت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ قادری سلسلے کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی (وفات ۱۱۶۶ء) سے اُسے جتنی عقیدت تھی اس کی شہادت اس کے معاصرین اور اس کے بعد کے مصنفین نے بھی دی ہے۔ اس مقالے میں ایک ایسی دستاویز کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں۔ اس دستاویز سے نہ صرف اس عظیم صوفی سے جو بغداد میں آسودہ ہیں، دارا شکوہ کے عقیدت مندانہ جذبات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس کی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس کے بارے میں لوگ ذرا کم ہی جانتے ہیں اور وہ پہلو ہے بغداد کے حاکموں سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش۔

یہ دستاویز ہے سلطنت عثمانیہ کے وزیر اعظم مصطفی پاشا کا خط[3] جو اس نے دارا شکوہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔[4] شہزادگی کے زمانے میں دارا شکوہ نے ایک خط اپنے نمائندے ملا شوقی کے ہاتھ بھجوایا تھا اور ساتھ میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور امام ابوحنیفہ کے مزارات جو بغداد میں ہیں اُن کے لیے کچھ تحفے تحائف بھی بہ طور نذر نیاز کے بھجوائے تھے۔ سترہویں صدی میں چوں کہ بغداد سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا، دارا شکوہ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر عثمانی حکام سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس دستاویز کا ترجمہ پیش کرکے میں نے اس مقالے میں کوشش کی ہے کہ اس کا تاریخی سیاق وسباق واضح کردوں اور دارا شکوہ کی تاریخ میں اس کی اہمیت بھی۔

یہ خط سلطنت عثمانیہ کے سرکاری دستاویزات جو 'منشات السلاطین' کے نام سے معروف ہیں، میں نقل کیا گیا ہے۔ دستاویزات احمد فریدوں بے نے مرتب کیے تھے، وہ سلطنت عثمانیہ کے وزیر اعظم محمد پاشا سوکولو[5] کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور یہ کتاب ۲۲ جنوری ۱۵۷۵ء[6] کو سلطان مراد سوم (حکومت ۱۵۷۵-۹۵ء[7]) کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

فریدوں بے کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ ۱۵۵۳ء میں وہ محمد پاشا سوکولو کے دفتر میں ملازم ہوئے تھے جو اس وقت رومیلی کے گورنر تھے۔ ۱۵۶۵ء میں جب ان کے افسر کا عہدہ بڑھ گیا اور وہ وزیر اعظم بن گئے تو فریدوں نے سلطنت عثمانیہ کے سرکاری معاملات میں زیادہ حصہ لینا شروع کیا۔ جون ۱۵۷۰ء میں وہ رئیس الکتاب (وزیر اعظم کے سکریٹری اور محکمۂ کتابت کے سب سے بڑے افسر) بنا دیے گئے اور دو سال بعد انھیں نشانجی کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔[8] لیکن اس شہرت پر زیادہ عرصے تک قائم رہنا فریدوں بے کی قسمت میں نہیں تھا۔ سلطان مراد سوم کی تخت نشینی اور پھر سلطان اور سوکولو کے درمیان کشیدگی کی وجہ سے فریدوں درباری سازشوں کا شکار ہوگیا۔ ۱۵۷۶ء میں اُسے نشانجی کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور اسے گورنر بنا کر سمندر سے بغداد بھیج دیا گیا۔ ۱۵۷۹ء میں سوکولو کے قتل کے بعد اُسے واپس استنبول بلایا گیا اور نشانجی کے عہدے پر دوبارہ تعینات کر دیا گیا۔ فریدوں کا انتقال ۱۵۸۳ء[9] میں ہوا۔

منشات کے کئی نسخے موجود ہیں۔ توپ کاپی سرائے کتب خانہ (استنبول) میں جو نسخہ محفوظ ہے وہ غالباً وہ نسخہ ہے جو پیش کیا گیا تھا۔ استنبول سے دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے: ۱۸۴۸-۴۹ء میں اور ۱۸۵۸ء میں۔ پہلے ایڈیشن کی دو جلدیں ہیں اور اس میں 735 دستاویزات ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں 840 دستاویزات ہیں۔ بہت سی دستاویزات جن میں زیر تبصرہ دستاویز بھی شامل ہے، سترہویں صدی کی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سلطان کو پیش کیے جانے کے بعد ہی اس میں شامل کی گئی ہوں گی۔

وزیر اعظم کا مکتوب گرامی بادشاہِ ہندستان کے فرزند ارجمند کے نام

جب تک شعاع آفتاب قائم رہے اور فرمانروائے زمین و آسمان پہ خلعت رخشندہ مرشح بہ ستارہ ہائے روشن در فلک بہ معراج رسیدہ دنیا کو تابانی دیتا رہے فرزند اکبر دودمان شاہی، مرجع فرمانروایان ہند وسندھ، مردم چشم مملکت و بادشاہت، تابانی حدیقہ شان و شوکت، خوش چین ابروئے سلطنت و بادشاہی، گوہر ممتاز ترین سلطنت و فرمانروائی، زینت دہ تاج و تخت، شہزادۂ نیک نام و خوش بخت کا ستارۂ اقتدار و خوش بختی، آفتاب تابان فلک شادمانی و ستارۂ نصرت و کامرانی بلند رہے اور وہ امید و آرزو کی کرنیں جگاتے رہیں۔ بعد از ادائے آداب عزت و احترام مروجہ و دیرینہ یہ تحریر مخلصانہ و دوستانہ شعلۂ شمع نصرت و کامرانی کو بطور تحفہ تیز بہائے آگاہی فہم و فراست حضور عالی ارسال ہے۔ حضور عالی کا مکتوب گرامی جو حضور کے ایک معتمد ملا شوقی زادہ مرتبت، فخر امرا و رکن سلطنت دین کی معرفت ساعت نیک میں پہنچا۔ عبارت ہائے الفاظ فصیح کہ نوک قلم عجیب و غریب کے وضع کردہ ہیں نہایت دل آویز ہیں اور لطف و کرم کے حامل اور ان کی چمک دمک معانی روشن کی دلیل۔ ان ہی کے

ذریعے عروسانِ مروت و خلوص جو خیالات و تصورات کے حجرہ میں متمکن تھیں، وہ فہم و ادراک کے تختِ عروج پر جلوہ افروز ہوگئیں۔ امامانِ عالی قدر، علمائے علم و فضیلت، منبرِ پارسائی و حکمت، محور و مدار شریعت، آقائے دانشمندان، جد ماجدانِ نجابت و افضلیت، رہنمائے اشرف ترین عقائد، صدر پیچ دانِ سنت، ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور محرمِ عالی صدق و صفا، سالکِ راہِ طریقت، صاحبِ آستانِ تقدس، غریقِ محبت الوہیت، خلعت پوشِ الہام و تقدس، نوشندۂ شرابِ قربت و محبتِ الٰہی، سید عبدالقادر جیلانی نوراللہ مرقدہٗ کے مزارات جنت نشان و منور کے لیے جو تحفے ارسال کیے گئے تھے وہ ملا شوقی مذکور زاد مرتبت، ہمراہ معتمدان اپنے خداوند آقائے بادشاہانِ گیتی، شاہِ فرمانروانِ دوراں، حاملِ اقتدارِ سلیمان، پناہِ جہاں، صاحبِ قراں، سکندرِ دوراں، بلند اقبال، صاحبِ جلال، منصف و فیاض و مہربان، خدا ان کی شان اور بڑھائے اور درازیٔ عمر عطا فرمائے اور ان کی سلطنت تا ابد قائم رہے، کی اجازت و عنایت سے ان مقاماتِ متبرکہ کے لیے روانہ کردیے گئے ہیں۔ ان شاء اللہ جیسے ہی وہ (ملا شوقی) اپنا کام پورا کرلیتے ہیں انھیں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں روکا جائے گا اور حضور کی حسبِ منشا حضور کی خدمت میں روانہ کردیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے گورنر بغداد، بصرہ اور لحسا کے اعلیٰ فوجی حکام (GENERALS) کو شاہی فرمان بھیج دیے گئے ہیں۔ مزید براں، اس مخلص کی طرف سے تاکیدی ہدایات کے ساتھ انھیں خط بھی روانہ کردیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ تمام بادشاہانِ نیک و خوش اطوار کی باہمی مراسلت سے (ان میں) آپس میں دوستی و اتحاد قائم ہوگا۔

خدا کرے کہ ان کی لائقِ ستائش خوبیوں کے خوش نما درخت دریائے خوشحالی و خوش بختی کے کنارے جڑ پکڑ لیں اور ان کی کامرانی و دولت پر زوال نہ آئے۔ بطفیلِ رسولؐ و آلہٖ[10]

(یہ ترجمہ خط کے اصل ترکی متن کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے — ادارہ)

تبصرہ

"سولہویں اور سترہویں صدی میں مغلوں اور عثمانیوں (یعنی ترکوں) کے تعلقات کچھ بہت اچھے نہیں تھے۔ دورِ جدید سے قبل کی ان دو مسلم مملکتوں میں سفیروں اور نامہ و پیام کا آنا جانا خال خال ہی تھا۔ دونوں مملکتوں کے سفارتی اور سیاسی مفادات بنیادی طور پر الگ الگ تھے۔ ترکوں کو یوروپ کی طرف سے فکر لاحق رہتی تھی، پہلی فکر اس (یوروپ) کی وسعت سے، پھر (اس کے) خطرے کے علاقے کی حیثیت سے اور اسی لیے ترکوں کو اپنے آپ کو یوروپ سے بچانے کی فکر ان کی سب سے بڑی فکر تھی۔[11] سوداگرانہ مملکت Merchant State (یعنی ایسی مملکت جو اپنا سرمایہ نفع کی خاطر تجارتی سرگرمیوں میں لگائے نہ کہ زمینوں پر قبضہ کرکے نوآبادی بنانے کے لیے) کی حیثیت سے سلطنتِ عثمانیہ کو یوروپ سے تجارت میں بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔[12] اس کے مقابلے میں مغلوں کے یوروپ سے کوئی سیاسی یا تجارتی مقاصد وابستہ نہیں تھے۔ وہ برصغیر میں اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں اور ایران کی صفویہ سلطنت اور وسط ایشیائی ازبکوں سے اپنے علاقوں کو محفوظ رکھنے ہی میں مصروف رہتے تھے۔ ایشیا میں ترک ازبکوں کے قریبی حلیف تھے۔ وہ ازبکوں کو فوجی اور اخلاقی مدد دیتے اور وہ ازبک سلطنت کی علاقائی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے پابند تھے۔ ایران کے خلاف ان کے جارحانہ ارادے بنیادی طور پر ازبک کی امداد ہی پر منحصر تھے۔ اس کے برعکس مغلوں کے تعلقات ازبکوں سے اتنے لطف و مہربانی کے نہیں تھے۔ اپنی سیاسی اور فوجی مجبوریوں کی وجہ سے ان کی دلچسپی یہ تھی کہ صفوی سلطنت قائم رہے۔ مغلوں اور ترکوں کی کوئی سرحد بھی مشترک نہیں تھی، اس لیے کوئی سرحدی تنازعہ ان کے درمیان نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان جغرافیائی اعتبار سے بڑا فاصلہ تھا جس کی وجہ سے براہِ راست کسی لڑائی بھڑائی کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہی وجوہ تھیں کہ وہ نہ ایک دوسرے کے حلیف بنے نہ رقیب۔

مغلوں اور ترکوں کے ایک دوسرے کے ساتھ ہونے کا امکان صرف یہ ہوسکتا تھا کہ وہ دونوں ایران کے مخالف ہوتے۔ جب بھی مغلوں کو صفویوں کی طرف سے خطرے کا احساس ہوتا یا ان کی طرف سے کچھ پریشانی کا امکان محسوس ہوتا وہ ترکوں کی طرف سیاسی اور اخلاقی امداد کے لیے نظریں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

راجیندر یادو کا ذکر، اردو کے حوالے سے

دوسری اور آخری قسط

اک شمع تھی دلیلِ سحر، سو خموش ہے

ڈاکٹر مظفر حسین سید (291، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

اس ناچیز کو اردو کے تعلق سے ان کے ایک نظریے سے شدید اختلاف تھا، وہ اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے حامی تھے، اولاً دیوناگری اور دوم رومن کی شکل میں۔ راقم نے اس سلسلے میں ہمیشہ ان سے بحث کی، منطقی و مدلل گفتگو کی کہ رسم الخط کسی بھی زبان کی روح کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسے بدل دینا زبان کو قتل کردینے کے مترادف ہے، نیز دیوناگری اور رومن دونوں ہی رسوم الخط اردو کے مخصوص مزاج اور اس کی طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے اور نہ ہی وہ ان تمام لسانی و صوتی تقاضوں کی تکمیل کرسکتے ہیں، جن سے اردو کی زندگی عبارت ہے۔ وہ ان دلائل کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اگرچہ ان کے پاس اس کا کوئی بدیہی جواز نہیں تھا، البتہ یہ صراحت ضرور کرتے تھے کہ ایران میں اسلام کی آمد کے بعد قدیم فارسی یعنی اژدویستا کا رسم الخط تبدیل کیا گیا تھا، پھر زمانۂ جدید میں ترکی زبان کا عربی رسم الخط بدل کر رومن کیا گیا تو کون سی آفت آگئی، مزید یہ کہ پنجابی زبان فارسی و گرمکھی ہر دو رسوم الخط میں لکھی جاتی ہے اور سرحد کے دونوں جانب فروغ پذیر ہے۔ اس پر یہ خاکسار ترکی بہ ترکی یہ عرض کرتا کہ آپ سندھی کو کیوں فراموش کرتے ہیں، اس کے بولنے والے تو اس ضمن میں بڑے شدید اور جذباتی ہیں! اڈوانی جی جیسے رجعت پسند نے بھی کبھی سندھی کا رسم الخط بدلنے کی تحریک نہیں چلائی۔ ظاہر ہے کہ اس دلیل کا جواب ان کے پاس نہیں ہوسکتا تھا، یوں بحث جاری رہتی تھی، نہ اس ناچیز نے کبھی ان کی بات مانی اور نہ انھوں نے اپنا موقف تبدیل کیا۔

ایک آدھ مرتبہ شرارتاً خاکسار نے یہ بھی کہا کہ غلطی کا ماخذ کہیں اور ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لے کر عبدالرحیم خانِ خاناں تک کسی مسلمان ہندی شاعر نے بھی یہ تصور پیش نہیں کیا کہ ہندی (ان ادوار کی ہندوی، برج اور اودھی) کا رسم الخط تبدیل کرکے اسے فارسی کے رنگ میں رنگ دیا جائے اور نہ ہی مغلوں نے کبھی اس طرف توجہ کی۔ انھوں نے تمام تر نئے نظام رائج کیے، یہ ظلم بھی کردیتے تو آج کم از کم یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ راجیندر جی کہاں چوکنے والے تھے، کہتے کہ کچھ نہ ہوتا، ہندی واپس اپنی جگہ چلی جاتی۔ آخر پنجابی اور بنگالی پر بھی فارسی رسم الخط مسلط کردیا گیا تھا، مگر دونوں واپس ہوگئیں۔ پنجابی جزوی طور پر اور بنگالی کلی طور پر۔ ایک دن اس ناچیز نے ایک زبردست دلیل پیش کی کہ آپ ہندی والوں نے تو مہاتما گاندھی کی پیش کردہ ایک بہترین عملی تجویز کو بھی یکسر مسترد کردیا تھا، وہ ایک مشترک ہندستانی زبان کے حامی اور وکیل تھے، جسے فارسی اور دیوناگری ہر دو رسوم الخط میں لکھا جاتا اور وہی ہماری سرکاری و قومی زبان ہوتی، نیز اردو اور ہندی اپنی اپنی جگہ زندہ اور برقرار رہتیں، علمی و ادبی سطح پر۔ اس طرح آزاد ہندستان میں زبان کا مسئلہ ہوتا ہی نہیں۔ اس دلیل پر انھیں خاموش ہونا پڑتا تھا، لیکن مصلحت آڑے تھی، اس لیے اپنا موقف تبدیل نہیں کرسکتے تھے۔ حقانیت ان کے مزاج کا حصہ تھی، اور یہ ہر فن کار کا پیدائشی وصف ہے، اس لیے انھی کو الزام کیوں دیا جائے۔ اس ذیل میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان تمام نازک مباحث کے باوجود کبھی کوئی تلخی ہوئی، نہ تصادم، تعلقِ خاطر بدستور استوار رہا، اور گفتگو ہمیشہ ایک زبردست قہقہے پر اختتام پذیر ہوتی تھی، جو ایک طرح سے ان کی شناخت بن گیا تھا۔ ہنسی کے فوارے مدھم ہوتے تو وہ کہتے، اچھا بھائی، عیسیٰ اپنی راہ، موسیٰ اپنی راہ۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف لازم ہے کہ رسم الخط

کے سلسلے میں ان کے اس درست یا نادرست موقف کے علاوہ ان کی زبان سے اردو کے خلاف کوئی ہلکا سا جملہ بھی کبھی نہ سنا گیا، نہ ان کی تحریر میں نظر آیا۔

راجیندر جی کے ساتھ راقم مضمون کے تقریباً تین عشروں پر محیط روابط و مراسم میں اردو کے ضمن میں صرف ایک مرحلہ شکایت اور کبیدگی خاطر کا آیا کہ ایک مرتبہ ماہنامہ 'ہنس' کی اوائل عمری میں انھوں نے پتا نہیں کس غفلت یا مصلحت کے تحت ہندی کے نامور دانش ور نامور سنگھ کا ایک مضمون بہ عنوان 'بابری بھاجات میں خدا کا ساجھا' شائع کردیا۔ مضمون کا عنوان تو شرانگیز تھا ہی، اس کا تمام تر متن انتہائی شدید طور پر ایک فسطائی اور فسادی ذہنیت کا غماز تھا، نیز اردو کی بے جا، بے بنیاد مخالفت پر مبنی اور سراسر عصبیت کا ثبوت۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس مضمون کے مشمولات خود اس کے مصنف کے معلوم و مشہور نظریات سے قطعی مماثل نہیں تھے۔ دراصل اُن دنوں دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تفویض کرانے کی تحریک شباب پر تھی۔ اس سلسلے میں کئی موثر مذاکرے و مباحثے بھی انعقاد پذیر ہو چکے تھے، اور اس ضمن میں حکومت وقت کی نیت بھی بہ خیر نظر آرہی تھی، لہٰذا اس سمت میں مثبت اشارے موصول ہورہے تھے۔ اس صورت حال میں ردعمل کیسے یا سراسر متعصب اردو کے ہندی پرستوں کو اردو کو حاصل ہوجانے والی اس ثانوی حیثیت کی معمولی مراعات کی گنجائش قبول محسوس نہ ہوئیں اور اردو کے خلاف ایک محاذ قائم ہوگیا، جس کا ایک ثبوت ڈاکٹر نامور سنگھ کا مضمون 'بابری بھاجات میں خدا کا ساجھا' تھا جسے 'ہنس' نے اپریل ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع کیا۔ یہ انتہائی زہریلا مضمون تھا۔ اگرچہ بعد میں اردو کو دہلی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ بہرحال مل گیا، قانونی طور پر۔ البتہ اس کی عملی حیثیت کیا ہے، یہ بحث دگر ہے۔

سچ یہ ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے علاوہ راجیندر یادو اردو کے خلاف نہ کسی محاذ آرائی میں شریک ہوئے، نہ کوئی اور عملی کارروائی ان کے ذریعے سرزد ہوئی۔ اس مضمون پر بھی بعد ازاں وہ پشیمان تھے، جس کا اعتراف انھوں نے اپنے اردو کے حلقۂ احباب میں کیا، نیز اس کی پاداش میں بہ طور تردید چند تحریریں شائع کیں اور بحث کو بہ عجلت تمام بند کردیا[۲]۔ اردو کے خلاف یہ ان کی واحد سرگرمی تھی، جو منظر عام پر آئی، اس لیے احباب نے اسے درگزر کردیا۔ البتہ شر میں خیر کا پہلو پوشیدہ ہونے کے مصداق اس مضمون کی مخالفت کے بہانے اردو کے تمام دانش ور، مصنف اور ادیب ایک آواز ہوکر سامنے آگئے تھے، حب علی میں نہ سہی، بغض معاویہ میں سہی، یہ اس حادثے کا ایک مثبت پہلو تھا، جس کا سہرا اگر (یہ اگر زبردست ہے) باندھا جاسکتا تھا تو راجیندر یادو کے سر پہ۔

فرقہ پرستی کے خلاف متشددانہ، قولی جہاد، نیز فسطائیت اور بالخصوص سنگھی سیاست کی کھلی مخالفت اور ہر سطح پر اس سے نبردآزمائی راجیندر یادو کا نصب العین تھی اور ہمیشہ رہی۔ اب اسے ان کی جرأت فکر، جسارت اظہار اور شجاعت کہیں کا مظہر قرار دیا جائے گا کہ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں ہنومان جی کو اولین دہشت گرد کا خطاب عطا کردیا اور یہی نہیں، بابری مسجد کے انہدام کے بعد کے پرآشوب دور میں بھاجپائی سیاست کی اس وقت کی سرخیل اوما بھارتی کے خلاف ایک انتہائی بے لاگ، بے باک اور شدید تنقید کا حامل مضمون اپنے رسالے 'ہنس' میں شائع کیا، جس کا عنوان تھا 'تمہارے گلے میں کس کی آواز ہے، اوما بھارتی'۔ اس مضمون میں انھوں نے اوما بھارتی کی قلعی اتار دی تھی اور یہ باور کرادیا تھا کہ تم صرف کرائے کی اداکارہ اور بھاجپائی قیادت کا محض بھونپو ہو، اس سے زیادہ ہرگز کچھ نہیں۔ ایسی بے مثال جرأت کا مظاہرہ کسی اور ادبی صحافی نے کیا ہو، یہ کم از کم ہمارے محدود علم میں تو نہیں۔ درحقیقت وہ ہر قسم کی عصبیت سے بلند و بالا اور منافرت کے زہر سے پاک و صاف تھے، ان کا یہ مثالی رویہ دم آخر تک رہا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، راجیندر یادو فسطائی اور فرقہ پرست قوتوں کے شدید اور فعال مخالف تھے، اس سلسلے میں وہ نہ تو کبھی زیر خلاف ہوئے نہ کبھی خائف اور نہ ہی انھوں نے اپنی زبان کو مصلحت کا پابند ہونے دیا۔ فسطائی قوتوں نے ان کے خلاف قانون سے لے کر پولیس اور ڈنڈے تک کا استعمال کیا، مگر وہ سینہ سپر رہے، نہ خوف زدہ ہوئے نہ میدان سے ہٹے۔ سیاہ چشمے کے سبب ان کی آنکھیں عموماً نظر نہیں آتی تھیں، مگر کبھی زیر لب تبسم، کبھی ہلکی سی ہنسی ہر حملہ آور جملے اور معاندانہ رویے کا خاموش جواب ہوتی تھی، اگر ظلم و زیادتی حد سے تجاوز کرتی تو ان کا جواب ایک جسارتی قہقہہ ہوتا تھا۔

انھیں مسلم مسائل اور مسلمانوں کے حالات سے یک گونہ دل چسپی ہمیشہ رہی، اس کا عملی ثبوت ان کے ذریعے شائع شدہ جریدہ 'ہنس' کا ایک خصوصی شمارہ تھا، جس کے مہمان مدیر ہندی کے مشہور ادیب اصغر وجاہت تھے اور معاون خاص اردو قلم کار شارق عالم ذوقی۔ وہ شمارہ 'مسلم امور و مسائل' کے لیے مختص تھا۔ اگرچہ 'ہنس' کا وہ خصوصی شمارہ صورت حال میں کسی انقلابی تبدیلی کا سبب تو نہ بن سکا، تاہم اس کے ذریعے ہندی داں طبقہ بڑے پیمانے پر غالباً پہلی مرتبہ مسلمانوں کے داخلی حالات، ان کو درپیش امور، ان کے تحفظات، نیز ان کی شناخت کے مسائل سے واقف ہوا، یوں اور کچھ نہ سہی آگہی کا فرض تو ادا ہو ہی گیا۔ اگر ان کے اس معمولی مگر درحقیقت غیر معمولی اقدام کو مسلم معاشرے کے تئیں ان کی توجہ اور خلوص کا مظہر مان لیا جائے تو ان کی چند دیگر کوتاہیوں کو نظرانداز کردینا سہل ہوگا[۳]۔

ایک حیرت ناک امر جس کا اظہار لازم ہے کہ راجیندر یادو نے گزشتہ کئی دہائیوں سے کوئی تخلیقی شاہکار ہندی ادب کو نہیں بخشا تھا، صرف ادبی صحافت کرتے رہے، اگرچہ یہ فرض انھوں نے بہ کمال اتم انجام دیا۔ ان کا قلم بھی جامد نہیں متحرک تھا، خصوصاً اداریہ نگاری کی شکل میں، اور چند غیر تخلیقی تصنیفات کے بہ وصف۔ تاہم تخلیقی خدمت کی غیر موجودگی میں بھی انھیں کوئی ادبی ٹھیکیدار ادبی تذکروں و محفلوں سے بے دخل نہیں کرسکا، وہ نہ کسی دانش گاہ میں پروفیسر تھے، نہ ڈاکٹر ادب تھے، پھر بھی دنیائے ادب ان کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرتی رہی، اور ہر شخص ان کے جریدے میں جگہ پانے کا متمنی رہا۔ کیا یہ کوئی ادنیٰ کمال تھا؟ انھوں نے بہ طور وراثت خاصا حصول ہے کہ ہندی اور ہندستانی ادب کو عطا کیا، یہ سب زبان و ادب کی تاریخ کا حصہ ہے، لہٰذا اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ یوں بھی زیر نظر نگارش تنقیدی نوعیت کی نہیں، بلکہ تاثراتی ہے، بس اقلیم ادب کے اس تاجدار کی شخصی عظمت کا اجاگر کرنا مقصود ہے۔

اس ہیچ مداں کو متعدد اکابرین علم و ادب کی ارادت مندی کا شرف حاصل رہا ہے، اور اس میں زبان کی شرط کبھی مانع نہیں رہی، اسی جذبۂ اخلاص کے تحت راجیندر یادو کے ساتھ تعلق خاطر برسوں بلکہ عشروں قائم رہا۔

ع خوش قسمتی کہ آپ سے قربت بنی رہی

ان گنت ملاقاتوں میں چند مجلسیں یادگار ہیں، جن میں سے ایک ملاقات چند ماہ قبل استاد محترم قاضی عبدالستار صاحب کی سیادت میں وقوع پذیر ہوئی، راجیندر جی کی رہائش گاہ پر۔ ہمارے وفد میں ایک نوجوان قلم کار بھی شامل تھے، اس رعایت سے خاکسار نے ان سے عرض کیا کہ دیکھیے آپ کے شوق ملاقات میں اردو ادب کی تین نسلیں ایک ساتھ حاضر ہیں۔ اس جملے سے وہ خوب لطف اندوز ہوئے اور اس کے عوض انھوں نے کئی لطیفے سنائے۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ اس خاصی طویل ملاقات میں گفتگو کا محور تقریباً تمام تر اردو ادب تھا، اور ہندی ادب کا ذکر ذیلی طور پر خال خال ہی آیا، اردو میں بھی زیادہ تر مجروح سلطان پوری کی شخصیت اور شاعری پر ہی بات ہوتی رہی۔ دراصل راجیندر جی برسوں پہلے کسی غیر ملکی ادبی دورے میں مجروح صاحب کے ہم سفر و ہم قیام رہے تھے اور ان کی ہم بزمی کی رنگا رنگ یادیں ان کے ذہن و دل میں تازہ تھیں۔

ملاقات کے اختتام پر انھوں نے 'ہنس' کا تازہ شمارہ اس عندیہ کے ساتھ عنایت کیا کہ اس کی قیمت بہ صورت خدمت بھی ادا کرنا لازم ہے۔ اسی وقت ہم نے ان کے بوقلمونی توشے میں سے ایک حسین و بیش قیمت قلم کو تاکا تو انھوں نے ہماری بدنیتی کو بھانپ کر کہا کہ ''آپ چاہیں تو یہ قلم لے لیں، ویسے سنسکرت کا ایک مقولہ ہے کہ 'کتاب، قلم اور بیوی کسی کو عاریتاً دینے کی چیز نہیں، گرگئی تو گئی'۔'' ہم نے ان کے اس بلیغ اشارے کو وصول کیا اور اس کے معنی کا ادراک کرتے ہوئے اپنی دریدہ حریص نگاہیں اپنے مطلوب قلم سے ہٹالیں، تبھی ہماری چور نگاہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ 'صاحب قلم' نے 'مال عرب پیش عرب' کے مصداق اپنے اس محبوب قلم کو بڑی چابک دستی سے ہماری دسترس سے ہٹا کے دور اور خود سے قریب کرلیا۔ دراصل راجیندر جی کے پاس قلموں کا بے نظیر ذخیرہ تھا، اسی طرح ان کے پاس تمباکو نوشی کے پائپوں کا بھی انبار تھا اور انھیں اپنے ہر قلم اور ہر پائپ کی قیمت و جائے خرید ازبر تھی، یہ بہرحال یہ داستان دگر ہے اور یہاں اس کا محل نہیں۔

راجیندر جی سے آخری ملاقات بڑی غم ناک و تکلیف دہ تھی، وہ مکمل طور پر صاحب فراش تھے، مگر خیال خاطر احباب میں کوئی کوتاہی نہ تھی۔ اسی ملاقات میں کچھ عرصہ قبل شائع شدہ ان کی ایک جذباتی و تاثراتی تصنیف کا ذکر آیا، وہ اسے اردو میں شائع کرانے کے متمنی تھے، اس عاجز قلم نے بہ طور نمونہ اس کے عنوان کا اردو ترجمہ ان الفاظ میں پیش کردیا: ''ایک مریض کے صحت مند خیالات''۔ یقیناً یہ ترجمہ پسند خاطر ہوا اور انھوں نے برملا کہا ''یار تم تو کام کے آدمی ہو، اس کا ترجمہ فوراً سے پیش تر کر گزرو''۔ ہم نے بہ خوشی حامی بھرلی، بلکہ وعدہ کرلیا، حیف کہ یہ کام ان کی حیات میں شروع بھی نہ ہوسکا۔ ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ روح فرسا خبر آگئی، جس کا اندیشہ ان کے تمام احباب و رفقا کو تھا، مگر اسے انگیز کرنے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ بہر کیف اس جہان سے اس جہان کا سفر سب کا مقدر ہے، سو ان کی حاضری کی ساعت بھی آگئی اور وہ حاضر جناب کہتے ہوئے مائل بہ پرواز ہوگئے۔ اس عاجز کو فخر ہے، اور رہے گا کہ اسے ان کے ساتھ ہم نشینی کے مواقع میسر رہے۔ یہاں فراق کا شعر تحریف کے ساتھ:

آنے والی نسلیں ہم پر فخر کریں گی، ہم عصرو
جب ان کو دھیان آئے گا، راجیندر کو دیکھا تھا

حواشی:

۱۔ یہ نہایت شاطرانہ چال تھی کہ مضمون آپ رسالے میں شائع کریں اور اس پر شرمندہ دوسری محفلوں میں ہوں۔
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
الغیب ہے وہ محفلیں اردو والوں ہی کی ہوتی ہوں گی۔

۲۔ یہ خلاف واقعہ ہے جب اردو والوں کی طرف سے وہ مضمون شائع ہوئے تو جواباً نامور سنگھ نے ایک اور مضمون لکھا جسے بعد کے کسی شمارے میں شائع کرکے آخری قسط لگانے کا شرف یادو صاحب نے نامور سنگھ ہی کو دیا۔

۳۔ اس شمارے میں اکثر مضامین ہندی سے ترجمہ کیے گئے تھے اور اکثر مترجم اناڑی کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اصغر وجاہت کی علمی حیثیت سے قطع نظر پیچیدہ مسلم معاملات پر ان کی نگرش محدود نوعیت کی ہے، اس لیے اس شمارے کی اشاعت میں انھوں نے عملاً کوئی دل چسپی نہیں لی۔ یہ شمارہ انقلابی تبدیلی تو کیا، مسلمانوں سے متعلق کسی زاویے پر بحث کا آغاز تک نہیں کرسکا۔ (مدیر)

اردو دُنیا

مغربی بنگال میں اردو کو روزگار سے جوڑنے کا عمل شروع

کارپوریشن میں عارضی اردو اسسٹنٹ کی بحالی کا فرمان

کلکتہ (یکم نومبر)۔ ریاست مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کے بعد اب اسے سرکاری دفتروں میں نافذ کرنے کا کام شروع ہوگیا ہے۔جس کے تحت کلکتہ میونسپل کارپوریشن نے اردو اسسٹنٹ کے عہدوں پر بحالی کے لیے اشتہار جاری کیا ہے۔ اردو کو روزگار سے جوڑنے کی قابل تحسین پیش رفت کے باوجود شفافیت نہیں ہے کیوں کہ یہ عارضی ملازمت پر بحالی ہورہی ہے۔ اس کے علاوہ وہی غلطی دہرائی جارہی ہے جو پچھلی مارکسی حکومت نے اردو میڈیم اسکولوں کے تعلق سے سرزد کی تھی۔ اردو کی بحالی کے عہدوں کے لیے شیڈول کاسٹ (ایس سی) اور شیڈول ٹرائب (ایس ٹی) کو الاٹ کیا گیا ہے، اس سے دہرا نقصان ہوگا کیوں کہ ایس سی/ایس ٹی میں کوئی اردو داں نہیں ہوتا ہے۔

اسمبلی میں مغربی بنگال آفیشیل لینگویج ایکٹ ۱۹۶۱ میں باقاعدہ ترمیم کرکے طے کیا گیا ہے کہ جن اضلاع، سب ڈویژن، بلاک یا میونسپلٹی میں اردو بولنے والوں کی آبادی دس فیصد سے زائد ہوگی وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے گا۔ اس کے لیے کلکتہ کارپوریشن، آسنسول کارپوریشن، ٹلی میونسپلٹی، رانی گنج میونسپلٹی، اسلام پور میونسپلٹی، اسلام پور بلاک، گوال پوکھر بلاک وغیرہ میں اردو کو اس کا حق دینے کے لیے ۲۰ر مارچ ۲۰۱۳ کو سرکاری نوٹیفیکیشن بھی جاری کردیا گیا۔ مگر اس کے نفاذ کے سلسلے میں وہ چستی نظر نہیں آئی جتنی کہ اردو کو اسمبلی میں بل لاکر اسے سرکاری زبان کا درجہ دینے میں دکھائی گئی تھی۔

گزشتہ دنوں کلکتہ میونسپل کارپوریشن نے اردو اسسٹنٹ کے چار عہدوں پر بحالی کے لیے اشتہار جاری کیا ہے۔ دراصل ۱۹۹۵ میں جب منڈل کمیشن کی سفارشات نافذ کی گئیں تو اردو میڈیم اسکولوں پر بھی اسے نافذ کیا گیا جس کا خمیازہ اردو اسکولوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ایس سی/ایس ٹی میں اردو داں ملنے کے نہیں ہوسکے کے سبب اردو میڈیم اسکولوں میں جتنے ایس سی/ایس ٹی کی سیٹیں ہیں وہ سب خالی پڑی ہیں اور تعلیمی معیار بری طرح متاثر ہورہا ہے۔ حکومت بدلنے کے باوجود اس کا تدارک نہیں ہوسکا، حالاں کہ اس سے پس ماندہ ذاتوں اور قبائلی طبقوں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ مومن کانفرنس جنوبی چوبیس پرگنہ کے جوائنٹ سکریٹری محمد رفیق انصاری نے بتایا کہ کلکتہ کارپوریشن کا اردو اسسٹنٹ کے عہدے کی بحالی کے لیے اشتہار سے اردو حلقے میں خوشی کی لہر پائی جاتی ہے لیکن کارپوریشن جیسے بڑے ادارے کی مناسبت میں اسامیوں کی تعداد بہت کم ہے لہٰذا ہر شعبے میں اردو مترجم کو بحال کرنا مناسب ہوگا۔

(اخبار مشرق۔کلکتہ)

مہاراجہ بھوج یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام

بھوپال۔ مدھیہ پردیش میں اردو زبان وادب کے لیے ستمبر واکتوبر کے مہینے بڑے ہی مبارک ثابت ہوئے کیوں کہ ان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی تعلیمی شاخ کے قیام کے لیے ریاستی حکومت نے زمین الاٹمنٹ کے آرڈر دیے اور اب مہاراجہ بھوج اوپن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کے بعد اردو ایم اے، ایم فل اور اردو میں پی ایچ ڈی کے کورسوں کا آغاز کیا گیا۔

یونیورسٹی کے گجرال ہال میں ایک پُروقار تقریب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے امیر دارالعلوم بھوپال مولانا محمد سعید مجددی نے شرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی محبین قوم اور دانش وران علم وادب کی موجودگی نے جہاں اس کا ثبوت پیش کیا کہ اردو کی ترقی و ترویج کی ہر کوشش میں ان کا عملی تعاون حاصل ہے وہیں پر شرکا کی تعداد کو دیکھ کر یہ بھی اندازہ ہوا کہ بھوج یونیورسٹی کے ذمہ داران اردو کی ترقی و ترویج میں سچ کے ہر طبقے اور اہل فکر رکھنے والوں کو ساتھ لے کر ہی اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج کے اس سفر کو طے کرنے والے ہیں۔ تقریب کے افتتاحی خطاب میں مولانا محمد سعید مجددی نے فرمایا کہ ہندستان میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی اور اس کی بقا کا کام ایک اہم خدمت ہے اور اس کو انجام دینے والے جہاں اردو کے محسن ہیں وہیں پر ملک اور قوم وملت کی خدمت کا عظیم فریضہ انجام دینے والی مبارک شخصیت بھی ہیں۔ مسند صدارت سے یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق ظفر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ایک لاکھ پچیس ہزار طلبہ میں اردو کے طلبہ کی بھی شمولیت ہورہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی میں جہاں ریسرچ جرنل، نیوز لیٹر، ترقیاتی رپورٹوں اور دیگر دستاویز اور وسائل میں سب ہی زبانوں کا استعمال کیا جارہا تھا اب اس میں اردو زبان کی تعلیم و ترویج بھی شامل ہوگئی ہے۔

تقریب میں اردو زبان وادب کی جن نمائندہ شخصیات نے شرکت کی ان میں پروفیسر ذکی الرحمٰن، پروفیسر مختار شمیم، پروفیسر شفیق النساء، پروفیسر حسان خاں، پروفیسر انظر راہی، ڈاکٹر سلمیٰ بلگرامی، پروفیسر مقیت النساء، پروفیسر طاہرہ عباس، ڈاکٹر عبید اللہ ندوی، پرویز باری، ڈاکٹر مرضیہ عارف، ڈاکٹر بلقیس شاہ، ڈاکٹر فرزانہ، ڈاکٹر قدسیہ اور انجم بارہ بنکوی کے نام اہم ہیں۔

(الجمعیۃ۔دہلی)

گورنمنٹ اردو میڈیم ہائی اسکول میں اساتذہ کی تقرری کا تیقن

جگتیال، آندھراپردیش (۷رنومبر)۔ گورنمنٹ ہائی اسکول پولاس میں اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرری کرنے کا سب کلکٹر جگتیال نے تیقن دیا۔ جگتیال منڈل کے موضع پولاس میں منعقدہ ایک پروگرام میں انھوں نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ بعد میں گورنمنٹ ہائی اسکول کے طلبہ وطالبات اور اساتذہ کے ہمراہ انھوں نے موضع میں ریلی نکالی اور پولاس کے ہیلتھ سنٹر، آنگن واڑی سنٹر اور اسکول کا معائنہ کیا۔ راشن ڈیلر شاپ کی تنقیح کی اور راشن کارڈس کی تفصیلات حاصل کرتے ہوئے راشن کارڈوں کا بھی معائنہ کیا، وہاں سے گورنمنٹ اردو میڈیم ہائی اسکول پہنچ کر اسکول کا معائنہ کیا اور تفصیلات حاصل کیں۔ اس موقعے پر انھوں نے طالبات سے اسکول کے مسائل اور بنیادی ضروریات کے متعلق بھی پوچھا جس پر اسکول کے اساتذہ اور طلبہ نے سب کلکٹر جگتیال کو بتایا کہ گورنمنٹ ہائی اسکول اردو میڈیم میں اردو، انگریزی اور فزکس کی اسامیاں خالی ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کی تعلیم متاثر ہورہی ہے۔ جس پر سب کلکٹر نے ڈی ای او کریم نگر سے بات کرتے ہوئے اردو، انگریزی اور فزکس کے اساتذہ کی تقرری کا یقین دلایا۔

(رہنمائے دکن۔حیدرآباد)

اترپردیش کے اردو مترجمین کا ریاست گیر احتجاج

گورکھپور (۵رنومبر)۔ اترپردیش اردو مترجمین کی تنظیم کے سکریٹری نصرت حسن نے ریاستی حکومت کے ذریعے اردو مترجمین کے لیے جاری کردہ نئے ضابطوں اور عہدوں کو فریب بتاتے ہوئے کہا کہ اس آرڈر کو واپس لینے کے لیے ریاست گیر احتجاج کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری سروس ضوابط کے مطابق سات سال کی سروس کے بعد پہلی ترقی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی طرح ۱۶ سال کے بعد دوسری ترقی اور ۲۴ سال کے بعد تیسرا پروموشن ہوتا ہے۔ اسی طرح پوری سروس کی میعاد کار میں ملازموں کا چار مرتبہ پروموشن ہوتا ہے لیکن نئے ضوابط میں اردو مترجمین کی ترقی کے لیے صرف تین مرحلوں کا التزام ہے اور چوتھے مرحلے سے انھیں محروم کردیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چوتھے مرحلے میں ان کا پے اسکیل 5000 روپے ہونا چاہیے مگر اب انھیں 4200 روپے پے اسکیل ہی ملتا ہونا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مساوی کام کے لیے مساوی تنخواہ کے اصول کے خلاف اور ناانصافی پرمبنی ہے، لہٰذا اس کی مخالفت کی جانی چاہیے۔ واضح رہے کہ ریاستی حکومت نے مختلف سرکاری دفاتر میں تعینات اردو مترجمین کے لیے نیا حکم نامہ جاری کیا ہے۔

(سالار۔بنگلور)

میدک ضلع میں اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کی منظوری کو یقینی بنانے کا مطالبہ

میدک، آندھراپردیش (۷رنومبر)۔ میدک مسلم ویلفیر سوسائٹی کے قائدین نے ضلع بھر میں اردو میڈیم اپرپرائمری، ہائی اسکولوں میں اساتذہ کی خالی اسامیوں کی منظوری کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرتے ہوئے پردیش کانگریس کمیٹی کے سکریٹری شیخ عبدالغنی کی قیادت میں صدر اقلیتی کمیشن آندھراپردیش جناب عابد رسول خاں سے حیدرآباد میں ملاقات کی۔ مسلم ویلفیر سوسائٹی کے وفد میں جناب خواجہ معین الدین، جناب نذیر احمد، محمد ریاض الدین اور محمد حفیظ الدین شامل تھے۔ انھوں نے صدر اقلیتی کمیشن کو تفصیلات سے واقف کرواتے ہوئے کہا کہ میدک ضلع میں اسکول اسسٹنٹ، ٹیچنگ پوسٹ اور پی ای ٹیز کی اسامیاں خالی ہیں، اس سے ایک طرف زیر تعلیم طلبہ کا شدید نقصان ہورہا ہے تو دوسری جانب قابل اردو امیدوار روزگار سے محروم ہورہے ہیں۔ اس کے باوجود ضلع انتظامیہ بالخصوص محکمۂ تعلیمات کے عہدیدار خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ڈی ای او سے 369 اردو اساتذہ کی اسامیاں خالی بتائی ہیں۔ سوسائٹی نے ضلع میدک میں 15000 طلبہ کے لیے پری میرٹ اسکالرشپ کی عدم اجرائی کے مسئلے سے بھی صدر نشین کو واقف کروایا اور اس ضمن میں کارروائی کرنے کی اپیل کی۔ پی سی سی سکریٹری شیخ عبدالغنی نے بھی سرکاری دفتروں کے سائن بورڈس پر اردو تحریر کرنے اور دیگر لسانی اقلیت کے مسائل سے صدر نشین کو واقف کروایا۔

(رہنمائے دکن۔حیدرآباد)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

انتخابات کا جمہوری عمل اور اردو کے حقوق کی خاطر اہل قلم کے تحرک کا مسئلہ کے بارے میں

مکرمی! 'ہماری زبان' کے یکم تا ۷ نومبر ۲۰۱۳ کے شمارے میں آپ کا اداریہ نما مضمون 'انتخابات کا جمہوری عمل اور اردو کے حقوق کی خاطر اہل قلم کے تحرک کا مسئلہ' پڑھا۔ آپ نے زبان کی محبت میں چند خدا لگتی باتیں لکھی ہیں اور اردو والوں کی غیرت کو للکارا ہے لیکن اردو والے خواب خرگوش میں غرق ہیں۔ ادارے اپنی مصلحتوں اور سودا وزیوں میں اور قوم اپنے نام نہاد تحفظ کے حوالے سے مذہب کی طرف گامزن اور مذہبی لوگ اختلاف مسلک میں ڈوبے ہوئے ہیں، تبھی تو شاعر نے کہا تھا:

حقیقت روایت میں کھو گئی
یہ امت خرافات میں کھو گئی

آپ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی ذکر کیا ہے اور سوال کیا ''اب وہ انجمن خدا جانے کہاں غائب ہو گئی ہے'' اس کی ضرورت پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب وہ انجمن بھی اپنے ماضی کو اپنی ذمہ داری کو بھول کر بھٹک گئی ہے یا گم ہو گئی ہے۔ کیا کیا جائے انجمن بھی تو انسانوں سے ہی بنتی ہے اور انسانوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ پھر انجمنوں کی بھی عمر ہوتی ہے جس کا حساب اس کی افادیت سے لگایا جاتا ہے۔ انجمن کی زندگی کے پچھتر سال سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں اب وہ ضعیف ہو گئی ہے اور اس کے چاہنے والے ضعیف الاعتقاد۔ اردو کا معاملہ صرف انجمن تک محدود بھی نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری شمس الرحمٰن فاروقی کی بھی ہے جو وقت پڑنے پر اتحاد کرنے بھی ہوئے تھے۔ ضرورت پھر سے اس بات کی ہے کہ سبھی دلدادگان اردو یکجا ہوں، متحد ہوں اور یہ سب آپ ہی کی انجمن کے بینر کے نیچے۔ اب آپ نے اداریہ لکھا ہے تو اب عمل بھی کیجیے اور جلدی سے ایک روزہ مذاکرہ کیجیے، سبھی طرح کے خیال کے لوگوں کو یکجا کیجیے اور صرف آج کے حالات میں اردو کی حیثیت و ضرورت پر غور کیجیے۔ میں اپنے قریہ سے الہ آباد سے آنے کو تیار ہوں۔ باذن لکھنؤ ہی کرنا ہے بھی تو آپ ہیں کے آپ پہل تو کیجیے۔ یہ ایک تاریخی لمحہ ہے۔ آپ میں جوش ہے، جذبہ ہے، نظریہ ہے، بس عمل کی ضرورت ہے۔

خدا آپ کو توفیق دے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

بات یوم اردو کی

مکرمی! اردو سے تعصب کے بادل چھٹ جائیں گے اگر ہم اردو والے مشہور اردو خاندان کی مقبول عالمی شخصیت پنڈت جواہر لعل نہرو کے یوم وفات ۲۷ مئی کو یوم اردو، اردو ڈے کے طور پر منانا شروع کریں۔ (محکمہ ڈاک سے بھی درخواست کی جائے کہ وہ اس روز اس نام سے یادگاری ٹکٹ بھی جاری کرے)۔

ابن غوری۔ معظم پورا حیدرآباد

اتر پردیش کے سرکاری دفاتر میں اردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ جاری

سہارنپور (۹ نومبر)۔ ضلع کے افسران اردو اخبارات کو اشتہار دینا تو دور اخبار کو دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ 25 روز قبل صوبائی سرکار نے یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ سبھی افسران کی نیم پلیٹ اردو میں بھی لکھی جانے کی مگر چالاکی یہ ہے کہ سب کچھ نمائشی ہے۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو اور وزیر کابینہ اعظم خاں نے سہارنپور آمد پر بہت مرتبہ یہ وعدہ کیا کہ ہم نے ڈائرکٹر انفارمیشن اتر پردیش کو یہ ہدایت جاری کر دی ہے وہ ہر ضلع میں ضلع مجسٹریٹ کے ذریعے یہ سرکلر جاری کریں کہ جہاں پر اردو پڑھنے والوں کی تعداد پندرہ فیصد سے زائد ہے وہاں پر سرکاری محکموں کے اشتہارات ہندی کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات میں بھی شائع کرائے جائیں مگر دکھ کی بات ہے کہ ضلع میں جتنے بھی اخبارات ڈی اے وی پی سے تسلیم شدہ ہیں گزشتہ پندرہ سالوں سے ان اخبارات کو مقامی سطح پر مقامی محکموں نے نمبر کے لکھے جانے تک دو فیصد بھی اشتہارات جاری نہیں کیے۔ محکموں سے جو اشتہارات کا آرڈر آتا ہے اس میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ جاگرن، امر اجالا، ہندوستان اور کسی دیگر ہندی اخبار میں چھپوایا جائے۔ ہم نے ضلع مجسٹریٹ سہارنپور سے باقاعدہ شکایت کرنے کے بعد ہی ڈی او، مگر گم، ایس ڈی ایم اور دیگر اہم سرکاری محکموں کو ضلع مجسٹریٹ صاحب کا ہدایت نامہ ارسال کرایا مگر اس کو بھی دو سال کا وقفہ گزر چکا ہے، آج تک ایک اشتہار ان محکموں نے اردو اخبارات کو جاری نہیں کیا ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے نئے دفتر کا افتتاح

میسور (۲۹ اکتوبر)۔ ۲۷ اکتوبر ۲۰۱۳ کو میلاد باغ میں سابق ریاستی وزیر اور میسور کے حلقہ نرسمہا راجہ کے رکن اسمبلی جناب تنویر سیٹھ نے انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے نئے دفتر کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے تنویر سیٹھ نے کہا کہ آج یہاں شریک تمام حضرات اپنے اپنے طور پر کئی دہائیوں سے اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور سب کی خواہش ہے کہ جیسے بھی ہو اردو زبان کی ترقی ہو۔ تنویر سیٹھ نے اعلان کیا کہ بہت جلد انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے لیے ایک سی اے سائٹ دلوانے کی کوشش کریں گے اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں پر اردو بولنے والوں کی آبادی زیادہ ہو تا کہ اردو کے حسن میں جو بھی اقدام کیے جائیں سب لوگ اس میں حصہ لے سکیں۔ تنویر سیٹھ نے امید ظاہر کی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے نئے اراکین اردو کی ترقی کے لیے اہم رول ادا کریں گے۔ سید اکرام نے نعت شریف پیش کی۔ انجمن کے سکریٹری سید احمد رحمٰن نے تمام حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ انجمن کے سابق سکریٹری پروفیسر سید منظور احمد نے افتتاحی تقریر میں انجمن کی تیس سالہ تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کا قیام ۱۹۸۳ میں کیا گیا، اس وقت ریاستی انجمن کے صدر بزرگ قائد الحاج عزیز سیٹھ مرحوم تھے، انھوں نے انجمن کی ترقی میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر سید منظور احمد نے مزید کہا کہ بانی صدر انجمن سلیم تمنائی مرحوم کی وفات کے بعد انجمن کے جلسوں میں کمی ہوئی اور انجمن کے دفتر کی دوری کی وجہ سے ایک طرح کا جمود رہا۔ اب شہر کے بیچوں بیچ میلاد باغ میں انجمن کے دفتر کا آغاز ہو رہا ہے اس لیے امید ہے کہ موجودہ اراکین مجلس عاملہ اس کی سرگرمیوں کو تیز کریں گے اور انجمن کو مزید فعال اور سرگرم کرنے کی کوشش کریں گے۔ موصوف نے مرحوم عزیز سیٹھ صاحب پر حکومت کرناٹک کی طرف سے شائع شدہ کنڑا کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے کی اپیل کی۔ مولانا محمد تسلیم صاحب نے اردو زبان و ادب کی ترقی اور بقا پر زور دیا اور انجمن کی کارکردگی کو سراہا۔ عبدالعزیز جاوید نے بزرگ قائد عزیز سیٹھ کی حیات و خدمات پر ایک سیمینار منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس موقع پر معروف شاعر گوہر ترکیروی نے کہا کہ آج اردو زبان کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے صدر قسیم صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کی مستقبل کے منصوبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رکن اسمبلی تنویر سیٹھ کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اردو کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں اپنی تائید کا اعلان کیا۔

(سالار۔ بنگلور)

ریاست آندھرا پردیش میں
اردو کی ترقی کا جائزہ لینے کے لیے 8 رکنی کمیٹی کا قیام

حیدرآباد (۱۸ نومبر)۔ ریاست میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن کی جانب سے ایک آٹھ رکنی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو ریاست کے تمام اضلاع کا دورہ کر کے بنیادی سطح پر اردو زبان کے سرکاری استعمال اور اردو کو روزگار سے مربوط کرنے کے لیے سفارشات کرے گی۔ ریاستی اقلیتی کمیشن کے صدر جناب محمد عابد رسول خاں نے آج سکریٹریٹ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات بتائی۔ صدر اقلیتی کمیشن نے بیرسٹر اسدالدین اویسی ایم پی کی جانب سے ریاست میں اردو کو پہلی سرکاری زبان کے موقف کے مطالبے کی ستائش کی اور کہا کہ سرکاری سطحوں پر اردو کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اردو کو جائز مقام نہیں مل رہا ہے۔ ایسے میں اگر ایک پالیسی ساز فیصلہ کیا جائے تو اردو زبان کو اس کا مستحق مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کمیٹی میں اردو زبان کے ماہرین اساتذہ، صحافی، شاعر اور سرکاری عہدیدار کو شامل کیا جائے گا جو ریاست کے تمام اضلاع کی رپورٹ پیش کریں گے۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر اقلیتی کمیشن حکومت سے اس رپورٹ پر عمل آوری کے لیے نمائندگی کرے گی۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

سرکاری دفاتر کے بورڈوں پر اردو زبان نظر انداز

اودنی، آندھرا پردیش (۷ نومبر)۔ اردو زبان ہمارے ملک کی اہم زبانوں میں ایک ہے۔ اس کے فروغ کے لیے کئی ادارے قائم ہیں اور سیاسی قائدین کی جانب سے اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے بڑے بڑے وعدے کیے جاتے ہیں، لیکن جب اس کو عملی جامہ پہنانے کی بات آتی ہے تو سیاسی قائدین تو بہت دور کی بات ہے خود عہدیداران بھی اس سے کتراتے ہیں، اس کی ایک مثال اودنی شہر میں دیکھی جا رہی ہے۔ چند دنوں قبل اردو زبان کو عام کرنے کے لیے محبان اردو نے ایک تحریک چلائی جس میں مختلف عہدیداروں کے نیم پلیٹ اور اودنی ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈز اور دفاتر وغیرہ اردو میں تحریر کروانے کی اپیل کی، لیکن آج تک وہ خواب ہی رہ گیا۔ جب محبان اردو ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، ایریا ہاسپٹل اودنی پہنچ کر اس سے متعلق یاد دہانی کرائی تو افسران کہہ رہے ہیں کہ ہمیں سائن بورڈ اردو میں لکھانے کے لیے اعلیٰ حکام کی اجازت نہیں ہوگی جب کہ اردو میں سائن بورڈ وغیرہ کی تیاری کا خرچ محبان اردو برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ صرف جگہ دینے کے لیے یہ حکام کتراتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن حکومت کی جانب سے جب دفاتر کے بورڈز تلگو اور انگریزی زبانوں میں تحریر کروائے جاتے ہیں تو اسی وقت انھیں اردو زبان میں بھی تحریر کروانے کی توفیق کیوں نہیں ہوتی۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : متاعِ بخشش
شاعر : مولانا قاضی غلام سجاد تجلّی بدایونی
ضخامت : ۱۲۸ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ڈاکٹر مسعود حسین صدیقی قادری
4/206 صاحب باغ
علی گڑھ-202004
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

پروفیسر مسعود حسین صدیقی قادری حمیدی کو اردو زبان و ادب سے شغف اور دلی لگاؤ موروثی ہے، ان کے خاندان کے بیشتر افراد کا شمار اہلِ علم و ادب میں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیشے کے اعتبار سے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج علی گڑھ میں صدر شعبۂ انھیسیا ہیں، ان کے خاندان حمیدی میں عموماً شادیاں اپنے کنبہ میں ہوتی ہیں اس لیے ان کے نانا اور دادا کا شجرۂ نسب ایک ہے۔

قاضی سجاد تجلّی بدایونی کے مورثِ اعلا شیخ حمید الدین گنا آبادی (گنور) متخلص بہ مخلص کنوری، غیاث الدین بلبن کے عہد میں ایران سے بدایوں آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ ان کی جائے سکونت آج بھی شیخ مُتی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اپنے مورثِ اعلا کی وجہ سے یہ خاندان حمیدی کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے بیشتر افراد صاحبِ علم تھے جو ۱۹۸۲ء تک بدایوں کے قاضی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے، اس لیے یہ خاندان 'قاضی خاندان' کے نام سے بھی مشہور ہے۔

کتاب 'متاعِ بخشش' کی ابتدا میں تجلّی بدایونی کا شجرۂ نسب، حسب اور سسرال دیا گیا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ تجلّی بدایونی کہتے ہیں:

یہ صدیقی نسب سجاد تیرا عہد ماضی ہے
کہ جوش ولا، حسن عمل، صدق و صفا دیتا

کلام سجاد تجلّی بدایونی کو عہدِ طفولیت سے ادبی ماحول ملا تھا۔ ان کو شعری ذوق وراثت میں ملا، دس سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا نعت سے کی۔

'متاعِ بخشش' تجلّی بدایونی کے نعتوں کے مجموعے کو تسلیم نوری بدایونی نے ترتیب دیا اور تجلّی کی حیات و کلام پر سیر حاصل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''تجلّی بدایونی اردو اور فارسی میں مشّاق تھے ہر دو ادبیات میں انھوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں''۔ (ص ۱۵)

نوری بدایونی نے مختلف رسائل اور اردو تذکروں سے تجلّی بدایونی کے بہاریہ کلام کے چند اشعار بھی نمونے کے طور پر درج کیے ہیں:

ہاں نسیم آرزو میں دل کشائی تھی مگر
ہم نفس نا رنگ جاں میں کر رہی دل نہ تھا

حیا نے اس لیے شاید زباں نہ کھلنے دی
کہ چشم شوق کو انداز گفتگو آئے

یہ بزم ناز کے آداب ہیں کہ اہلِ نیاز
لیے ہوئے دل محزوں شگفتہ رو آئے

تجلّی بدایونی کے کلام میں احترامِ آدمیت و انسانیت، شرم و حیا کی پاسداری ہے۔ عریانی، فحاشی اور لغویات سے ان کا کلام پاک و صاف ہے۔

'متاعِ بخشش' میں 20 نعتیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ منقبت ابوبکر صدیق، علی، حضرت حسینؓ، غوث الاعظم، مولانا عبد المقتدر عثمانی قادری، تضمین قصیدہ محسن کاکوروی، تضمین بر غزل راقب بدایونی، تضمین بر غزل علامہ اقبال اور تضمین بر غزل شیوا بریلوی شم پاکستانی وغیرہ ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں فارسی اور عربی کلام درج ہے۔ چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مری افتادگی کی داد اے بادِ صبا دینا
پس مردن مری مٹی مدینے میں اُڑا دینا

نعت کا حق تو ادا ہو نہیں سکتا پہ کہوں
برتر از خلق ہو تم، اشرف و اعلیٰ تم ہو

رحمت رب کی نہیں ہے حد، تو نومیدی نہیں
آپ ہیں شافع تو پھر ہیں کن گنہگاروں میں ہم

'متاعِ بخشش' میں تجلّی بدایونی کا کلام کوزے میں سمندر سمونے کی طرح ہے۔ بائیس سطری مسطر پر بہت صاف ستھرا کمپوز کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں فہرستِ نعت و منقبت بنا کر شامل کر دی گئی ہوتی تو قاری کو بار بار اپنی پسند کی نعت وغیرہ کو پڑھنے میں آسانی ہوتی۔ کتاب کے دوسرے اڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ گنبد خضرا سے مزین ٹائٹل دیدہ زیب اور روح کو سرشار کرنے والا ہے۔ مسعود حسین صدیقی

لائقِ مبارک باد اور صد ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنے نانا کے کلام کو تلف ہونے سے بچایا اور بہ حفاظت رکھا۔ اب اس کی طباعت کی خواہش کو 'متاعِ بخشش' کی شکل میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جو لائقِ تحسین ہے۔ اردو کے نعتیہ ادب میں 'متاعِ بخشش' بہترین اضافہ ہے۔

●●●

بقیہ: دارا شکوہ اور سلطنتِ عثمانیہ

صفحہ ۴ سے آگے

دوڑاتے۔ برنارڈ لیوس کہتا ہے ''صرف ایک بات ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب رکھتی تھی، وہ تھی دونوں کو ایران کی شیعہ سلطنت سے خطرہ۔ ترک جب بغداد کے قریب لڑ رہے ہوتے یا مغل قندھار کے پاس لڑ رہے ہوتے تو وہ دشمن کے علاقے کے دوسری طرف ایک اور محاذ کے بارے میں سوچنے لگتے۔ ایسے ہی مواقع ہوتے تھے جب ترکی اور ہندستانی بندرگاہوں کے درمیان سفیروں کا آنا جانا رہتا تھا''۔[13]

مغلوں اور ترکوں میں رشتہ قائم کرنے کی پہلی کوشش اکبر (حکومت ۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نے کی تھی۔ تخت نشینی کے تھوڑے دن بعد ہی اُس نے ترک ایڈمرل Sidi Ali Reis کی معرفت ایک خط اپنے ہم پایہ سلطنتِ عثمانیہ کے سلطان سلیمان عالیشان (حکومت ۱۵۲۰-۱۵۶۶ء) کو بھیجا تھا۔[14]

(باقی آئندہ)

بقیہ: مولانا آزاد کے ایک ہم عصر...

صفحہ ۸ سے آگے

اسٹیشن، کچہری، بازار یا دفتر میں بوقتِ نماز سربسجود ہوتے دیکھتے تھے تو اپنے شذرات میں ایمان پروری کی اس حکایت کو بیان کرتے ہوئے اُن کے لفظ لفظ سے خوشی چھلکی پڑتی تھی، لیکن جب انھوں نے اپنے دہلی کے سفر میں شفیق الرحمان قدوائی کی سادگی نماز و قبر دیکھی تھی تو ان کی تحریر سے غم و غصہ اُبل پڑا تھا، البتہ گورنر صوبۂ بہار ڈاکٹر ذاکر حسین کے چہرے پر نماز کا نورِ عمل قیصر سے گزرنے کے باوجود اس ماجد کو تسلی بن گیا تھا کہ ''بہرحال یہ بھی کیا کم ہے کہ دواڑھی موجود اب بھی ہے۔''

وہ ساری عمر اکبر کی تقلید میں مغرب کی تنقیص میں سرگرم رہے۔ نیاز نے لکھا تھا کہ 'وہ بادۂ افرنگی کی مذمت میں اپنی رومانی کے غم سے غم لنڈھاتے رہتے ہیں، لیکن یہ بھی نہیں بتاتے کہ مسلمانوں کے بے ہیے بہک جانے کا راز کیا ہے!'

مولانا آزاد کے سرِ کار و فکر و فہم کو جداگانہ رہے تھے۔ اُن کی چشمِ تصور میں اگر ایک طرف جمنا کے کنارے ڈیرا ڈالنے والے قافلے کی... آٹھ سو سالہ سلطنت و سطوت کے پرُ فخر نظارے بسے ہوئے تھے تو دوسری طرف اُس مشترکہ تہذیب کا عروج سے لے کر زوال تک کا سفر اور نوّے سالہ سیاسی جد و جہد کے انجام میں خلقت کیعان وطن کے ہجرت کے نام پر اختیار کیے ہوئے فرار کا غم اُنھیں نم دیدہ بنا دیتا تھا۔

مولانا ماجد نے اپنی 'آپ بیتی' میں یہ جو لکھا ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد سے 1918 میں اپنی مخالفت ختم کر دی تھی تو یہ غالباً 'الہلال' کے دور کی شکر رنجی کی بات رہی ہوگی، کیوں کہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے وہ زندگی بھر مولانا آزاد کے مخالف ہی رہے۔ تقریباً نصف صدی کی ہم عصری میں اگر چند موتے حسین باہمی کے ان اکابر کے یہاں مل جاتے ہیں تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے باہمی تعلقات کے چلتے رہنے کی مکاتبت میں اپنے ایک خط میں مولانا آزاد نے ماجد کے قلمتے کے شوقِ تحصیل پر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح اپنے ایک اور مکتوب میں انھوں نے 'معارف' میں ماجد کا 'مکالمات برکلے' پر سلسلۂ مضمون پڑھ کر ان کی خوبیِ تحریر کی داد دی تھی، اور جب وہ وزیرِ تعلیم ہوئے تو ایک بار مولانا ماجد کے ذریعے دہلی آنے کی اطلاع دینے پر مولانا آزاد نے اُنھیں لنچ پر مدعو کر کے اپنی خوش خلقی اور خوش طرفی کا نقش اُن کے دل پر قائم کر دیا تھا۔ اسی طرح مولانا ماجد بھی مولانا آزاد کی زندگی میں کہیں کہیں اُن کے زورِ خطابت اور طرزِ انشا کی مدح و ستائش کرتے نظر آتے ہیں، خاص طور پر وہ 'غبارِ خاطر' کی نثر کے قتیل تھے، لیکن اُنھوں نے مولانا آزاد کی ذہانت و ذکاوت، سیاست و فراست اور علم و استعداد کی دل کھول کر داد اُن کی موت کے بعد لکھے اپنے تعزیتی مضمون میں دی تھی، یہ سوچ کر کہ:

رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے!

انھوں نے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے دائرۃ المعارف عثمانیہ کو بچانے اور قائم رکھنے کے لیے مولانا آزاد کے فیصلے کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا تھا اور تقسیم کے بعد کے نامساعد حالات میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی حیاتِ نو کے لیے اُن کی مساعیِ جمیلہ پر اظہارِ ستائش بھی۔ وہی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جہاں ڈاکٹر ضیاء الدین کے دور میں محمد علی (مولانا اور جناح) کے شیدائی طلبا نے مولانا ابوالکلام اور مولانا حسین احمد مدنی کی آمد پر اُن کی ریش و داماں کو تار تار کر دیا تھا[15]۔

مولانا آزاد نے مولانا ماجد کے خلاف غالباً ایک سطر بھی کہیں نہیں لکھی۔ انھوں نے، سیاست کی رستا خیز کو الگ چھوڑ دیں، تو دین و ادب کے محاذوں پر کیسی کیسی مخالفتوں کا سامنا کیا، لیکن اُن کا مجموعی رویّہ یہی رہا:

یا دوستاں تلطف یا دشمناں مدارا

مولانا ماجد آزادی سے قبل اگر مولانا آزاد کے سیاسی مسلک کے خلاف تھے تو آزادی کے بعد اُن کے سیاسی منصب کے۔ اس میں حیرانی کی بھی کوئی بات نہ تھی، مولانا کا سیاسی منصب قبول کرنا بہت سے دانش وروں کو پسند نہ آیا تھا۔ مولانا ماجد نے تقسیمِ ہند سے قبل مولانا آزاد کی سیاسی وابستگی کو (ان کی ایک کتاب پر تبصرے کے ضمن میں) یوں آڑے ہاتھوں لیا تھا:

اکبر نے تو یہیں تک کہا تھا ''انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی'' لیکن یہاں معاملہ ان حدود سے بھی گزر چکا تھا۔ یہاں بات تو 'اُن' کی تھی ہی، زبان بھی اپنی نہیں رہی تھی، انھیں کی ہو گئی تھی''۔[16]

آزادی کے بعد مولانا آزاد کو طنز و تعریض کا نشانہ بنانے کے مواقع انھیں اور آسانی سے ہاتھ آنے لگے۔ انھوں نے کبھی بھی یہ حقیقت ملحوظ نہیں رکھی کہ مولانا آزاد ایک کثیر تہذیبی ملک کے وزیرِ تعلیم ہیں، جہاں 85% غیر مسلم آباد ہیں اور یہ ایک سیکولر ملک ہے، کوئی مذہبی ملک نہیں۔ اپنے اخبار 'صدق' میں بھی وہ مولانا آزاد کی زبان میں ہندی الفاظ کے بڑھتے تناسب کو دیکھ کر اُن کی 'لسانی ہندوی' کی خبر دیتے تھے، بطورِ علامت بتاتے تھے اور کبھی اپنی 'نیچی باتیں' کسی فرضی گزار کی زبانی اس طرح کی مضحک نگاری کی نذر کر دیتے تھے:[17]

''اب الکلام فلسفہ منتری اپنے کمرے میں 'کلیاتِ نظیری' یا 'کلیاتِ عرفی' کی بجائے تلسی داس کی ہندی رامائن کے مطالعے میں لگے ہوئے ہیں۔''

بھی عورتوں کی ذہنی بیداری اور تعلیم کی اہمیت پر اُن کے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے دیے گئے بیان پر اپنے رقیبِ ذہنی کے اظہار سے مخالفت کا اظہار کیا کرتے تھے تو کبھی اُن کے موسیقی و رقص کی اکاڈمی کھولنے کے اعلان کو بُت شکن کی بت گری سے تعبیر کرتے تھے۔[۳۰] مولانا آزاد کے ذریعے ایک رئیسِ ریاست کے عطیے کو ٹھکرانے کا واقعہ، 'اندرونی' کی اڈیٹری کے لیے مولانا آزاد سے شبلی کا اصرار، مولانا آزاد کا غیر ملکی سفر ایسے حقائق ہیں، جنھیں محققینِ آزاد ثابت کر چکے ہیں، پر مولانا ماجد اپنی تحریروں میں انھیں افسانوی باور کراتے رہے تھے۔

ملی تحریک میں مسلمانوں کی بے حسی کو دیکھتے ہوئے مولانا آزاد نے انھیں 'آزادی کی راہ میں سنگِ گراں' قرار دیا تھا، اسی طرح اکتوبر 1947 میں اپنی جامع مسجد کی تقریر میں انھوں نے اُن کی غفلت و انکار کی روش کی سرزنش کی تھی اور تقسیمِ وطن کے المیے پر انھیں بُری طرح ڈانٹا تھا۔ یہ تلخ حقائق اگر مولانا ماجد کے لیے تلخی کا موجب، کام و دہن کی آزمائش بن گئے تھے تو کوئی حیرت نہیں، اس لیے کہ اُن کے بعد بھی ہمارے عہد کے بہت سے دانش ور ان سچائیوں کو پچا نہیں پائے تھے۔ ظ انصاری جیسے ہم مشق نے تو مولانا آزاد کی جامع مسجد کی تقریر کو نیم افسانوی ہی کہہ دیا تھا۔ عجیب کہ اسی عہد کے 'صدق' (7 نومبر 1947) میں اس پر مولانا ماجد کی تنقید دیکھی جا سکتی ہے۔

مولانا ماجد کے لکھے ہوئے کوئی ساٹھ باسٹھ نثری وفیاتوں کا مجموعہ اُن کے معاصرین و اکابر پر، عبدالقوی دسنوی نے (1978 میں) 'وفیاتِ ماجدی' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ مولانا ماجد نے اُن مرحومین میں سے کسی کا حال سطے دو سطے میں تو کسی کا دس گیارہ تک صفحوں میں رقم کیا ہے۔ مولانا آزاد کے سانحۂ ارتحال پر اُن کے تاثرات کا دس گیارہ سطروں پر مشتمل ایک صفحہ نظر آتا ہے اور چودھری خلیق الزماں کی موت کے صدمۂ عظیم کے اظہار میں چھ صفحے ملتے ہیں؛ یہ وہی چودھری خلیق الزماں تھے، جنھوں نے آزاد ہندستان کی ریاستی اسمبلی میں ہندستان کا وفادار رہنے کا حلف اٹھایا تھا، مگر جب حکومتِ ہند کی جانب سے خیر سگالی کا وفد لے کر پاکستان گئے تھے تو پھر پاکستان ہی کو پیارے ہو گئے تھے۔

مولانا آزاد کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے زمانے اور ماحول کے انسان نہیں تھے، اور زمانہ اُن کے دل و دماغ سے جیسا کہ حق تھا کام نہ لے سکا۔ شاید ہر دانش ور کا یہ المیہ ہوتا ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے بعد پہچانا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے آج بھی اُن کے فکر و عمل کی صحیح قدر و قیمت کو پہچانا ہے!

حواشی

۱ 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'، بہ روایت ملیح آبادی، پہلا اڈیشن 1958، ص: 212 تا 311
۲ 'چند یادیں' از: مولانا عبدالماجد دریابادی، مشمولہ 'الجمعیۃ' دسمبر 1958
۳ ایضاً
۴ ایضاً۔ مولانا ماجد نے 'غالباً 1910' کا سال لکھا ہے، لیکن نومبر 1910 تک علامہ شبلی اُن سے نہیں ملے تھے اور مولانا ماجد 'تنقید الکلام' لکھ رہے تھے۔ غالباً یہ 1911 کی بات ہے۔
۵ بحوالہ ادارتیہ 'ہمدرد' (16) دسمبر 1926 از مولانا محمد علی
۶ محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق از: مولانا عبدالماجد دریابادی، ص: 8،9
۷ 'حدیث الغاشیۃ' کے تحت عنوان 'محمود نیم شبی کو صحیح نماز' کا مضمون 26 فروری اور 5 اور 12 مارچ 1913 کے پرچوں میں نکلا تھا، مگر اس کے سیاق و سباق میں 'الہلال' کے 12،5 فروری اور 12 اپریل 1913 کے پرچوں میں بھی 'حدیث الغاشیۃ' کے تحت مسلم یونی ورسٹی کے مسئلے پر سلسلۂ تحریر جاری تھا۔
۸ 'آپ بیتی' مکتبہ فردوس، لکھنؤ، پہلا اڈیشن 1978، ص: 261
۹ 'ملفوظاتِ ابوالکلام آزاد' مرتبہ: مالک رام، ص: 93، ساہتیہ اکاڈمی اڈیشن 1991
۱۰ ایضاً، ص: 95
۱۱ 'الہلال' 20 اگست 1913 المراسلۃ والمناظرہ
۱۲ 'آپ بیتی' ص: 150،151
۱۳ 'چودھری محمد علی ردولوی'، مشمولہ 'وفیاتِ ماجدی'، مرتبہ عبدالقوی دسنوی، پہلا اڈیشن 1978، ص: 201، کسی اور جگہ انھوں نے یہی دعوت 1917 میں کرنے کا ذکر کیا ہے۔
۱۴ 'ملفوظاتِ ابوالکلام آزاد' ص: 101
۱۵ ایضاً، ص: 98
۱۶ 'نقوش- آپ بیتی نمبر' (حصہ دوم) ص: 1074
۱۷ ایضاً، ص: 1075
۱۸ 'حکیم الامت: نقوش و تاثرات'، از مولانا عبدالماجد دریابادی، پہلا اڈیشن ص: 364
۱۹ 'وفیاتِ ماجدی'، ص: 96
۲۰ 'افکارِ خاطر' مرتبہ: مالک رام، ساہتیہ اکاڈمی 1983، ص: 149
۲۱ 'ترجمان القرآن' مشمولہ 'آج کل'، 'ابوالکلام نمبر' اگست 1958، ص: 82
۲۲ 'فروغِ اردو' (لکھنؤ) 'عبدالماجد دریابادی نمبر' (1971) ص: 153
۲۳ 'صدق'، 7 اگست 1970
۲۴ 'مولانا محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق' از: عبدالماجد دریابادی
۲۵ 'نشریاتِ ماجدی' (حصہ اول)، ص: 225، مطبوعہ تسنیم بک ڈپو
۲۶ 'گیارہ سفر' مرتبہ: عبدالقوی دسنوی، ص: 364، پہلا اڈیشن 1980
۲۷ مولانا ماجد نے اُن گستاخ طلبا کی مذمت میں تو کچھ نہیں لکھا، البتہ بہت بعد میں اُن کے قلم سے نکلے ایک جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اُن زعمائے عصر کی تذلیل کو ان لڑکوں کی شوخی قرار دیا ہوگا۔ "شوخیاں تو سب ہی لڑکے کرتے ہیں اور علی گڑھ کے لڑکے تو اپنی شوخیوں کے لیے کچھ زیادہ ہی مشہور ہیں۔" (در تبصرۂ 'یادوں کی برات')
۲۸ 'صدق'، 3 جولائی 1946
۲۹ دیکھیے، 'صدق'، لسانی شذرہ، 16 اپریل 1948، 'ز کنارہ بہ کنارہ' 5 جون 1946 اور 'فروغِ اردو' عبدالماجد نمبر، ص: 164
۳۰ 'صدق' 21 مارچ 1947
۳۱ 'ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر' مولفہ: ظ انصاری، ص: 101، پہلا اڈیشن 1990

◆◆◆

تیسری اور آخری قسط

مولانا آزاد کے ایک ہم عصر مولانا دریابادی

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیتن اپارٹمنٹ، بیلوپیڈرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی 400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

آزاد بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور ان کی آنکھیں بھی اشک بار ہوا کرتی تھیں، کبھی سقوط ادرنہ پر، کبھی شہدائے طرابلس پر، کبھی عزل خلافت پر اور اس کے بعد کے زمانے میں کبھی ہندو مسلم تفریق پر، کبھی دینی تحریک سے مسلمانوں کی دوری پر اور کون کہہ سکتا ہے کہ تقسیم وطن پر ان کی آنکھوں سے جوئے خوں نہ بہتی ہوگی!

مولانا آزاد کی قرآن کی بے نظیر تفسیر 'ترجمان القرآن' کی پہلی جلد ستمبر 1931 میں اور دوسری اپریل 1936 میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ اصل دین خدا پرستی اور نیک عملی کی تلقین ہے اور سعادت و نجات کی راہ اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کرلی جائے۔ یہ اصل اصول ہمیں 'وحدت ادیان' کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ انھوں نے سورہ فاتحہ کی تفسیر اور سورہ بقرہ کی کئی آیات کی تشریح سے یہی پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ 'دین' دراصل عقیدہ وعمل کی ان سچائیوں کا نام ہے جنھیں پیغمبر ہر زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں، ان ہی کی تنقیح اور تجزیہ کرکے قرآن حکیم نے دہرایا ہے۔ اعمال، عبادات اور فروعی احکام میں جو اختلافات مذاہب میں ہیں، وہ انسانی استعداد اور دوسرے حالات کا نتیجہ ہیں۔

صاحبانِ علم نے مولانا آزاد کی بصیرتِ فکر کی داد دی، لیکن راسخ العقیدہ اور تقلید پسند علما بدظن رہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا تھا کہ 'جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہاد وفکر سے محروم ہوکر تقلید محض اور جمود ذہنی کی زندگی بسر کررہے ہوں، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مجتہد فکر کا پیدا ہونا، ان کے لیے ہیجان کا باعث ہی ہوسکتا ہے۔'[۲۱]

ایسے میں یہ امر باعث حیرانی نہیں بنتا کہ مولانا ماجد بھی 'ترجمان القرآن' اور اس کے نظریۂ وحدت ادیان کے مخالفین کی صف میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے دسیوں شذرات 'ترجمان القرآن' کی مخالفت میں سپرد قلم کیے اور پھر اپنے تفسیری ترجمے میں، جس کا سلسلہ انھوں نے 'صدق' میں 1933 سے شروع کیا تھا، اختلافی نکات پیش کیے۔ یکم اگست 1930 کے 'صدق' میں چھپے ان کے شذرے کا لب ولباب یہ تھا کہ 'مساوات ادیان کے نظریے نے شرک کو بڑھایا ہے۔' جب انھیں یہ خبر ملی کہ لاہور میں مولانا آزاد کے 'ترجمان القرآن' کے انگریزی ترجمے کا منصوبہ بن رہا ہے تو انھوں نے اسے (یکم ستمبر 1939 کے 'صدق' میں) 'ایک غلط اقدام' سے تعبیر کیا تھا اور 29 جنوری 1954 کے 'صدق جدید' کے ایک شذرے میں انھوں نے 'وحدت ادیان' کو 'پیام ضلالت' ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

مولانا آزاد نے اس باب میں بڑی زحمتوں کو برداشت کیا اور غالباً اپنے دل کو یوں سمجھا لیا کہ:

مقامات فکر و نظر کون سمجھے
یہاں لوگ نقش قدم دیکھتے ہیں

مولانا ماجد کے والد خود ڈپٹی کلکٹر یعنی سرکاری نوکر تھے۔ مولانا ماجد نے اپنی 'آپ بیتی' میں لکھا ہے کہ:

"جب سے میں نے اپنے ہوش کی آنکھیں کھولیں، مسلمانوں کی مسلم پالیسی 'سرکار انگریزی' کی تائید و وفاداری کی پائی۔ علی گڑھ تو خیر اس کے لیے مشہور ہی تھا، باقی دیوبند، ندوہ، فرنگی محل، بریلی، بدایوں وغیرہ و مشائخ اور یہ قومی لیڈر، اردو اخبار سب اسی خیال و عقیدے کے تھے کہ سرکار کی وفاداری کا دم بھرتے جائیے، مذہبی کاموں میں یہی تقاضا ہے۔" (ص 260)

اور یہ وہ گروہ تھا جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے:

شیخ سے خانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

یہ اپنی عافیت پسندی کے ساتھ تحریک آزادی سے اگر کسی حد تک دل چسپی رکھتا تھا تو اس لیے کہ مسلمانوں کو ایک ملک حاصل ہوجائے گا۔ مولانا ماجد نے تقسیم سے قبل کا منظر نامہ یوں دکھایا ہے:

"1946 میں سالم وغیر منقسم ہندوستان میں آخری بار الیکشن ہوئے۔ اس میں مسلم لیگ کے امیدواروں کو شان دار فتح حاصل ہوئی تھی۔ جب وہ منظر یاد آتا ہے تو سینے پہ جیسے سانپ لوٹ جاتا ہے۔ کس طرح گلی گلی اللہ اکبر کے نعرے لگ رہے تھے۔ کون جانتا تھا کہ اس سرزمین پر اللہ کے نام کی یہ آخری پکار جلوسوں کی شکل میں ہے۔"
(ص 264)

اور آزادی کے بعد کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

"پاکستان کے قیام کا میں اصولاً حامی تھا، ... تقسیم ملک کا انجام مسلمانوں کے لیے اتنا دردناک اور ہولناک ہوگا، اس صورت حال کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور اب تک جو گزر رہی ہے، اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔"
(ص 263-264)

اگرچہ بعد میں انھیں احساس ہوگیا ہوگا کہ:

حلقۂ گل میں ہم کس دام بلا میں آئے

لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی اپنے سیاسی موقف پر پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس دور میں تقسیم وطن کے ممکنہ خوں چکاں نتائج کا کرب تو احساس سب ہی کو تھا لیکن غالب کے لفظوں میں مولانا ماجد

بے دشنۂ نجربہ، بدو معتمد زخم

کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

مولانا ماجد نے یہ جو کہیں لکھا ہے کہ انھوں نے 'نہرو رپورٹ' کے بعد مولانا آزاد کی سیاسی فکر سے دوری بنالی تھی تو یہ خارجی فضا کی وجہ سے، جس کسی کی بھی بات ہے، ان کا عملی سیاست سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھوں بیعت کرلی تھی لیکن اپنے پیرومرشد مولانا تھانوی کی ہدایت پر، ان کی سیاسی فکر سے بارہ پتھر باہر رہنا پسند کیا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ملازمت، صحافت، ہدایت اور احتساب ادب کے محفوظ و مامون راستوں کو چنا اور اپنی دانست میں لوگوں کو جنت کی راہ پر لے جانے میں کوشاں رہے، جب کہ مولانا آزاد نے خارزار سیاست میں برہنہ پائی اختیار کی اور تقریباً ایک دہائی کی قید وبند کی صعوبتیں ان کا مقدر رہیں، یعنی اپنی زندگی کا ہر ساتواں دن جو عام لوگ چھٹیوں کی موج میں گزارتے ہیں، انھوں نے جیل میں گزارا تھا، اور پھر بھی غالب کے لفظوں میں حال یہ تھا کہ:

دو گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوییم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتوان گفت

مولانا ماجد اپنی تمام عمر سیکولرزم اور نیشنلزم کے تصور سے متنفر اور بیزار رہے۔ جب غالب پر لکھی ایک کتاب کے انتساب میں غالب کو سیکولر اقدار کا حامل بتایا گیا تو جز بز ہوتے ہوئے بہت چڑ گئے تھے: "یہ سیکولرزم نہیں، سیکولرزم کا ہیضہ ہے، گویا غالب اتنے سادہ لوح اور بیباک تھے کہ ان کے نزدیک زہر اور تریاق سب ایک اور ایک سا ہے۔"[۲۲] علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مطبوعہ کتابچے 'سیکولر علی گڑھ' میں ظاہر ہے سیکولرزم سے متعلق پہلوؤں کا ہی احاطہ کیا جاسکتا تھا، وہاں بھی مولانا ماجد کو شکایت رہی کہ اس میں شعبۂ دینیات اور خود اس پر نسبر کے شعبۂ اسلامیات کا ذکر کہیں نہیں آیا۔[۲۳] مولانا محمد علی ایک عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے، جب انھوں نے 'گول میز کانفرنس' میں اپنے 'غلام ہندستان میں نہ مرنے' کی بات کہی اور پھر وہ ہفتوں کے بعد بستر ہی پر لندن میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی تو گویا ان کا وہ الہامی قول ان کے جذبۂ حب الوطنی کا عنوان بن گیا تھا، لیکن مولانا ماجد کو اپنے پیرو کی زندگی سے زیادہ تدفین اور ان کی قبر آئی۔ انھوں نے لکھا تھا "وہاں مدفن صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو تاج اونچا اٹھ چکا ہو اسے نیشنلزم کی کھچی پر زبردستی گھسیٹ کر لایا جارہا ہے۔"[۲۴] انھوں نے اپنے ایک شذرے میں 'قومیت' کے ساتھ وطنیت، افضلیت اور پندار تفوق کے ملحقات کی بنا پر رونما ہونے والی خرابیاں بیان کی تھیں،[۲۵] لیکن مولانا محمد علی کے کم از کم وقت اخیر کے خالص دینی جذبے کے ساتھ تو یہ آلائشیں بھی جڑی نہ تھیں!

مولانا ماجد کا جذبۂ حب سیکولر ہندستان کے تقاضوں کو سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ آزادی کے بعد وہاں کے ایک سفر میں انھیں وہاں کے مسلمانوں کی حالت، اترپردیش کے مسلمانوں سے کافی بہتر ان اسباب کی بنا پر نظر آئی کہ "وہاں مسلمان ترکی ٹوپی اور تہمد باندھنے سے نہیں شرماتے اور بعض بعض تو جناح کیپ بھی لگائے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سڑک بھی 'جناح روڈ' ہے۔ ہوٹلوں میں ملتا ہے کہ ذبیحہ کا ذبیحہ کھلم کھلا ملتا ہے۔ مسجدوں کی بھی خاصی تعداد اور نمازیوں کی کثرت ہے۔"[۲۶] وہ جب کسی مسلمان کو رشتے

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org